

کہ اصلاح کا کوئی بندوبست کرنے سے پہلے اس متعذرانہ جذبہ سے اپنے تئیں بالکلیہ آزاد کر لیں جو انہوں نے اپنے دین کے ساتھ اختیار کر رکھا ہے۔ ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ غیرت و خودداری کے ساتھ زندگی بسر کرے۔ اسے اس امر کا پورا پورا احساس ہونا چاہئے کہ اس کی ذات باقی دنیا سے متمیز و مختلف ہے۔ اسے چاہئے کہ اپنے مختلف ہونے پر فخر کرنا سکھے۔ اسے چاہئے کہ اس فرق و اختلاف کی ایک گراں بہا وصف کی طرح حفاظت و حیانت کرے۔ اور دنیا کے سامنے اس کا دلیری سے اعلان کرتا رہے۔ بجائے اس کے کہ اس کے متعلق معذرت پیش کرتا پھرے اور دوسرے ثقافتی حلقوں میں مدغم ہونے کی کوشش کرتا رہے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ مسلمان خارج سے آنے والی صداؤں سے اپنے تئیں بالکل ہی بے تعلق رکھیں ان پر کوئی کان ہی نہ دھریں۔ اپنی تہذیب کو مصرت پہنچائے بغیر اجنبی تہذیب سے ایجابی موثرات ہمیشہ اخذ و قبول کئے جاسکتے ہیں۔ اس قسم کی مثال ہمیں یورپی نشاۃ ثانیہ میں ملتی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یورپ نے آموزش کے مواد و منہاج میں عربوں کے اثرات کس مستعدی کے ساتھ قبول کر لئے تھے۔ لیکن یورپ نے عربی ثقافت کی ظاہری دھنچ اور ثقافت کی روح کی تقلید کبھی نہیں کی اور نہ اپنی عقلی اور جمالیاتی خود مختاری کو کبھی قربان کیا۔ یورپ نے اپنے زمانہ میں ہیلائیاتی اثرات استعمال کئے تھے۔ ان دونوں صورتوں میں یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ ایک ایسی طاقتور ملی تہذیب پروان چڑھتی گئی جو خود اعتمادی سے بھرپور تھی۔ اس فخر کو کھو کر اور اپنے ماضی سے رشتہ ناتہ توڑ کر کوئی تہذیب نہ صرف پھل پھول ہی نہیں سکتی بلکہ اپنا وجود بھی باقی نہیں رکھ سکتی۔

دنیا کے اسلام کی ذہنی اور سماجی غفلت | لیکن دنیا کے اسلام کا یہ حال ہے کہ یورپی تہذیب کی تقلید کرنے اور مغربی تصورات و خیالات کو جذب کرنے کی طرف اپنے بڑھتے ہوئے میلان کے ساتھ ان بندھنوں کو تدریجاً توڑتی چلی جا رہی ہے جو اسے اپنے ماضی سے جوڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ نہ صرف ثقافتی اعتبار سے پسپا ہوتی جا رہی ہے بلکہ روحانی اعتبار سے بھی۔ اس کی مثال اس درخت کی سی ہے جو اس وقت تک مضبوط تناور رہا جب تک اس کی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں پوسٹ تھیں۔ لیکن مغربی تہذیب کے کوسستانی دھارے نے مٹی کا ایسا صفایا کیا کہ یہ جڑیں اوپر کو نکل آئیں۔ درخت قلت غذا کی وجہ سے آہستہ آہستہ کمزور و ناتواں ہوتا جا رہا ہے۔ اسکی پتیاں جھڑتی اور ہڈیاں سکھتی جا رہی ہیں۔ اب تو اس کا ایک تنہا ہی باقی رہ گیا ہے جس کے گر پڑنے کا خطرہ ہر آن لگا ہوا ہے۔

پھر تو مغربی دنیا نے اسلام کو اس ذہنی اور سماجی غفلت سے بیدار کرنے کا صحیح ذریعہ ہرگز نہیں ہو سکتی جو اس انحطاط نے طاری کر رکھی ہے جس نے ایک عملی مذہب کو ایک رواج محض کے مرتبہ پر گرا دیا ہے۔ پھر مسلمان اپنے لئے روحانی اور عقلی، تسبیح و تشریق کہاں سے حاصل کریں جسکی انہیں آج اتنی شدید ضرورت ہے۔؟

اس کا جواب اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ سوال۔ یہ تو خود سوال کے اندر ہی موجود ہے، جیسا کہ کئی بار بتایا جا چکا ہے کہ اسلام نہ صرف دل کا عقیدہ ہی ہے بلکہ انفرادی اور سماجی زندگی کا ایک نہایت ہی واضح اور معروف نظام بھی ہے، اگر اس کو ایک ایسی اجنبی تہذیب میں مدغم کر دیا جاتا ہے جسکی اخلاقی بنیادیں سر تا سر مختلف ہوں تو یہ بالکل ہی برباد ہو جائے گا۔ لیکن اگر اسے دوبارہ اپنے منصب صداقت پر فائز کر دیا جاتا ہے۔ اور ایک ایسے عامل کی قدر عطا کر دی جاتی ہے جو ہمارے شخصی اور سماجی وجود کے تمام پہلوؤں کو متعین و متشکل کرتا ہے، تو پھر اس میں ایک نئی زندگی پیدا ہو سکتی ہے۔

نئے تصورات اور مقاصد ثقافتی لہروں کے زیر اثر جو اس دور کی مخصوص خصوصیت ہیں، جس میں ہم رہ رہے ہیں، اسلام ایک خالی پکی کی حیثیت سے زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہ سکتا۔ اس پر سے صدیوں کی نیند کا ظلم ٹوٹ چکا ہے۔ اب تو اس کے لئے صرف دو ہی صورتیں ہیں، یا تو وہ خواب سے بیدار ہو جائے یا موت سے ہم کنار ہو جائے۔

آج جو مسئلہ مسلمانوں کو درپیش ہے وہ ایک ایسے مسافر کا مسئلہ ہے جو ایک دور ہے پر پہنچ گیا ہے، یا تو وہ اپنی جگہ کھڑا رہ جائے، آگے قدم نہ بڑھائے۔ اس صورت میں وہ فاقوں کی موت مر جائے گا۔ یا وہ اس راہ پر چل پڑے جس پر اس عبارت کی تختی لگی ہے ”مغربی تہذیب کی طرف“ اس صورت میں اسے اپنے ماضی کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دینا ہوگا۔ یا وہ دوسری راہ اختیار کرے جس پر اس عبارت کی تختی لگی ہے ”صداقت اسلام کی طرف“۔ یہی اور صرف یہی وہ راہ ہے جو ان لوگوں کے قلب و دماغ کو اپنی طرف کھینچتی ہے، جو اپنے ماضی پر اور اس ماضی کے ایک زندہ مستقبل کی صورت میں مبدل ہو جانے کے ارکان پر یقین رکھتے ہیں۔

دیرینہ، پیچیدہ، جسمانی، روحانی | جمال شفا خانہ رحیم پور۔ نوشہرہ ضلع پشاور
امراض کے خاص معالج

جناب اختر راہی - بی اے

جہادِ حریت میں علماء حق کا حصہ

ہمارے اسلاف

ایک نذرِ مجاہد ایک جید عالم

ایک شخصیت ایک تاریخ

علامہ فضل حق خیر آبادی

خاندان | مولانا فضل حق کے جید امجد بہاء الدین اپنے بھائی شمس الدین کے ہمراہ ہندوستان آئے، شمس الدین رشتک کی مجلس افتاء پر رونق افروز ہوئے اور بہاء الدین قاضی بدایونی کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ شمس الدین کی اولاد میں امام الہند شاہ ولی اللہ جیسے فخر روزگار نے جنم لیا اور بہاء الدین کی نسل میں فضل حق خیر آبادی جیسے مجاہد آزادی نے نام پیدا کیا۔ سرزمین ہند میں یہ خاندان اپنی تابندہ روایات کے طویل علمی و جاہلیت اور مذہبی سیادت کا حامل تھا۔ اسی سبب درس و ارشاد کا وارث فضل حق وقت آنے میں میدانِ جہد و جہاد میں کود پڑا۔

مولوی رحمن علی نے انہیں عمری، حنفی، ماتریدی اور چشتی کے القاب سے یاد کیا ہے۔ یعنی مولانا کا نسب خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا ہے۔ مولانا عبدالشاہ خان شروانی مقدمہ نگار "الثورة الهندیہ" کی رائے کے بموجب ۳۳ واسطوں کے ذریعے یہ سلسلہ نسب قائم ہوتا ہے۔ فقہی مسلک کے لحاظ سے حنفی ہیں۔ کلامی مسائل میں ماتریدی نقطہ نگاہ کے حامل ہیں اور تصوف میں چشتی سلسلے سے منسلک ہیں۔ انہوں نے دھرم شاہ دہلوی سے بیعت کی تھی۔

مولانا فضل حق کے والد فضل امام دہلی میں صدر الصدور کے عہدے پر فائز تھے۔ ابتدائی تعلیم ان سے ہی حاصل کی، شاہ عبدالقادر محدث دہلوی سے حدیث کا درس لیا۔ عبدالشاہ خان

کے خیال میں شاہ عبدالعزیز سے بھی فیض اٹھایا۔ ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں پیدا ہوئے اور تیرہ برس کی عمر میں علوم مروجہ میں عبور حاصل کر لیا۔ ان کے ہم درسوں میں مفتی صدر الدین آزرہ کا نام خاصی شہرت کا حامل ہے۔ اس دور کا ذکر کرتے ہوئے عبدالرشاد خان لکھتے ہیں کہ مولانا فضل حق درس لینے رئیسانہ ٹھاٹ باٹ سے جایا کرتے تھے۔ اس سے ان کی امارت اور ناز و نعم کا پتہ چلتا ہے۔ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ چار ماہ اور کچھ دنوں میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔

عبدالرشاد خان نے ایک روایت بیان کی ہے کہ تحفۃ اشناعشریہ (من تالیف ۹۰-۸۹-۸۶) کی اشاعت پر ایران سے باقر داماد صاحب افق المبین کے خاندان کا ایک جید عالم شاہ صاحب سے مناظرے کی غرض سے دہلی آیا۔ شاہ صاحب نے مہمان کی شب گزاری کا سامان کر دیا۔ شام کے وقت فضل حق مہمان کے ہاں گئے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد علمی بحث شروع ہو گئی۔ مولانا نے ”افق المبین“ پر اعتراضات کئے جن کا جواب ایرانی عالم سے نہ بن پڑا۔ پھر خود ہی ان اعتراضات کو رفع کیا۔ اس ربط کے سے وہ جید عالم اس قدر متاثر ہوا کہ مناظرے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ سچا کہ جس شخص کے شاگردوں کی ذہانت و بہارت کا یہ عالم ہے وہ خود کس درجے کا ہوگا۔

مدارس اسلامیہ میں قدیم سے یہ خیال چلا آتا ہے کہ جب تک پڑھا ہوا پڑھایا نہ جائے علم میں پختگی نہیں آتی۔ چنانچہ مولانا فضل حق نے بھی درس و تدریس کا شغل اختیار کر لیا۔ مولوی رحمن علی لکھتے ہیں کہ ایک بار لکھنؤ میں مولانا کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ دیکھا کہ حقہ پنی رہے تھے اور شطرنج بھی کھیل رہے تھے۔ ساتھ ساتھ ایک طالب علم کو ”افق المبین“ کا درس بھی دے رہے تھے۔ اور تمام مطالب بڑی خوبی سے بیان کرتے جا رہے تھے۔

چودہ پندرہ کا سن تھا کہ درس و تدریس شروع کی۔ مولانا فضل امام نے ایک کند ذہن خاص عمر کا طالب علم ان کے حوالے کر دیا۔ اسے تھوڑا سا سبق پڑھایا اور پھر کتاب اٹھا کر پھینک دی۔ اس پر وہ طالب علم مولانا فضل امام کی مذمت میں حاضر ہوا اور کیفیت عرض کی۔ چنانچہ مولانا فضل حق بلائے گئے۔ مولانا فضل امام نے اس زور سے تھپڑ مارا کہ دستار فضیلت دور جا پڑی اور غیض آلود انداز میں فرمایا:

”تو تمام عمر لسم اللہ کے گنبد میں رہا، ناز و نعم میں پرورش پائی جس کے سامنے

کتاب رکھی اس نے خاطر داری سے پڑھایا۔ طلبہ کی قدر و منزلت تو کیا جانے
اگر مسافرت کرتا۔ بھیک مانگتا اور طالب علم بنتا تو حقیقت معلوم ہوتی۔ طالب علم
کی قدر ہم سے پوچھو۔
یہ سلسلہ تعلیم ۵۳ برس کی عمر تک جاری رہا، جیسا کہ مولوی رحمن علی کی ملاقات سے واضح
ہوتا ہے۔

ملازمت اور خود داری | والد کے انتقال کے وقت مولانا کی عمر اٹھائیس سال تھی۔
پیر شاہ شانی کا دور تھا کہ دہلی میں ریزیڈنٹ بہادر کے دفتر میں سررشتہ ہو گئے۔ مولانا نازک مزاج
اور خود دار واقع ہوئے تھے، لیکن اس ملازمت میں عزت و احترام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا
چنانچہ استعفیٰ دے کر اس ناگوار ماحول سے جان چھڑالی۔ نواب فیض محمد خان والی جھجھرنے پانصد
روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا اور بعد قدر و منزلت اپنے ہاں بلا لیا۔ دہلی سے روانہ ہوتے ہی
ابوظفر بہادر (جو اُس وقت ولی عہد تھے) سے ملاقات ہوئی۔ ابو ظفر نے اپنا خاص دو شالہ
اڑھایا اور چشم پرفیم کہا:

”ہر گاہ شہانی گوئید کہ من رخصت می شوم مرا جزا میں کہ بید لرم گریز نیست اما ایزد
دانا کہ لفظ وداع، زدل بزبان نمی رسد الابصار ہر ثقیل۔“

جھجھرنے کے بعد الور میں دو سال تک کسی بڑے عہدے پر فائز رہے۔ اس کے بعد نواب
ٹونک کے ہاں بھی قیام کیا۔ بعد ازاں نواب یوسف علی خان والی رامپور نے بلا لیا، اور پہلے محکمہ
نظامت اور پھر مرافعہ عدالتین پر مامور کیا۔ نواب یوسف علی خان اور نواب کلب علی خان نے
والائے تلمذہ کیا۔ آٹھ برس تک رامپور میں قیام کے بعد لکھنؤ چلے گئے۔ یہاں پہلے صدر الصدور
جائے گئے، اور جب ایک کچھری ”مختصر تحصیل“ کے نام سے وجود میں آئی تو اس کے ہتھم قرار
پائے گئے آخر گورنمنٹ ہنومان (متصل اجودھیا۔ فیض آباد) کے المیہ سے متاثر ہو کر ملازمت چھوڑ دی۔
واقعہ یوں ہے کہ
اور اذان کہتا تو مار پیٹ کر نکال دیا جاتا۔ ۱۳ ذی قعدہ ۱۲۶۱ھ (جولائی ۱۸۵۵ء) کو شاہ

غلام حسین اور مولوی محمد صالح اعلا نے کلمۃ اللہ کی خاطر ہنومان گڑھی گئے۔ پیراگیوں سے مقابلہ ہوا
مسجد میں دو سو انتہر مجاہدین شہید ہو گئے۔ کسی نے تاریخ کہی ہے۔

پچھلے سال کم چوں ہمت بہت مہم غیب گفت یافت شکست

دوسری روایت یہ ہے کہ مولانا احمد اللہ شاہ مدد اسی قیام لکھنؤ کے دوران میں ان سے
ملے تھے اور مولانا نے احمد اللہ شاہ کے کہنے پر ملازمت چھوڑ دی۔ اور الوداع چلے گئے۔
مولانا کی علمی زندگی | مولانا ایک کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور رئیسوں کی
طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ بچپن میں سبق پڑھنے کے لئے بھی ہاتھی اور پاکی میں جاتے تھے۔
جفا کشی سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ علمی و تدریسی شوق کی بدولت القبہ ان کا شمار علماء کے گروہ
میں ہونے لگا تھا، لیکن افکار و خیالات اور اعتقادات کی بناء پر ان کی حیثیت کوئی زیادہ
پر وہ جاہل نہ تھے۔ شاہ اسماعیل شہیدؒ کی "تقویت الایمان" کی ایک عبارت پر امتناع نظیر
خاتم النبیین اور ارکان نظیر کی بحث چھیڑ دی۔ غالب سے چونکہ مولانا فضل حق کے تعلقات
دوستانہ تھے، لہذا اس بحث میں غالب کو بھی گھسیٹ لیا۔ اگرچہ غالب کو ان مسائل سے
بقول حالی کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن دوستداری کی خاطر اشعار غنوی لکھ دئے۔

مولانا غالب کے گہرے دوست تھے کیونکہ طرفین میں اشتراک مذاق پایا جاتا تھا۔ مولانا
شعر فہم بھی تھے اور غالب کی طرح شطرنج سے بھی دل بہلایا کرتے تھے، ان حالات کو دیکھتے
ہوئے کسی کے دہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی کہ مولانا فضل حق ایک دن تن آسانی کو چھوڑ
کر یک نخت جہد و جہاد میں کود پڑیں گے۔

تصانیف | مولانا نے گوناگوں مشاغل کے باوجود تصانیف کی خاصی مقدار چھوڑی ہے

- ۱۔ المجنس العالی شرح جواہر المعالی
- ۲۔ شرح افق البین
- ۳۔ حاشیہ تلخیص الشفاء
- ۴۔ حاشیہ شرح مسلم قاضی مبارک
- ۵۔ ہدیہ السعیدہ
- ۶۔ رسالہ تشکیک ماہیات
- ۷۔ رسالہ کئی طبعی
- ۸۔ رسالہ علم و معلوم

۱۔ قیصر التواریخ ج ۲ ص ۱۱۲
۲۔ علماء حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں ص ۵۰
۳۔ یادگار غالب

- ۹۔ ردض المجود فی حقیقت وحدۃ الوجود
۱۰۔ رسالہ قاطع غوریاس
۱۱۔ رسالہ تحقیق حقیقت الاجسام
۱۲۔ الثورۃ الہندیہ (باغی ہندوستان)
۱۳۔ قصائد رنقۃ الہند
۱۴۔ مجموعۃ القصائد
۱۵۔ امتناع نظیر
۱۶۔ تحقیق الفتویٰ فی البطلان الطغویٰ

مولانا ویسے تو علم و فضل کے دریا تھے، لیکن عربی ادب اور معقول میں ان کا درجہ بہت
عزیم تھا۔ ”علمائے ہند“ میں ”رسالہ تشکیک اور رسالہ طبعی دلی“ کو ایک ہی رسالہ بتایا گیا
ہے، مگر حقیقت یہ نہیں۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کے شاگرد مولانا عبداللہ بلگرامی نے تصانیف
کا شمار کراتے ہوئے لکھا ہے۔ ”رسالہ فی تحقیق الکی والطبعی ورسالہ فارشیہ فی تحقیق التشکیک“
ان دونوں رسالوں کی زبانیں ٹھیک ہیں، اور یہ دونوں رسالے طبع نہیں ہوئے۔

سرخن فہمی | مولانا کے وطن خیر آباد میں شاعری کے چرچے تھے، دہلی میں آئے تو
یہاں قلعہ معلی سے لیکر بخش خان کے پھاٹک تک شاعروں کے بھگتے تھے، غالب،
صہبائی، مومن، آزاد، نیر، نثار، شیفتہ، مومن، نصیر اور ذوق وغیرہ آسمان شاعری
کے درخشاں ستارے تھے۔ اس شاعرانہ ماحول میں یہ ناممکن تھا کہ مولانا جیسا نازک مزاج اور
شاعر طبع شخص شعریہ کہتا، عربی و فارسی دونوں زبانوں میں اشعار کہے، لیکن عربی کو نسبتاً زیادہ برتا،
فارسی شاعری میں فرقتی تخلص کرتے تھے۔
فرقتی در کتبہ رفتی بار بار
نامسلمان نامسلمانی ہنوز

اردو ادب پر احسان | عربی زبان میں بیسیوں تصانیف کہے ہیں — مرزا غالب سے
غایت درجہ بڑے بڑے تعلقات تھے۔ مرزا ابتدا میں بیدل کے تتبع میں مشکل پسندی کی طرف
مائل تھے اور اس مشکل پسندی نے غالب کے کلام میں عزابت پیدا کر دی تھی۔ آخر غالب
نے اس قدیم اور مشکل روش کو چھوڑ کر آسان کہنے کی عادت بنائی۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ
”مولوی فضل حق صاحب فاضل بے عدیل تھے۔ ایک زمانے میں دہلی میں
سررشتہ دار تھے۔ اس عہد میں مرزا خان کوتوال تھے، وہ مرزا قلیل کے شاگرد

تھے نظم و نثر فارسی اچھی لکھتے تھے، غرضیکہ یہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسہ اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے۔ انہوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا، تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا جو کچھ کہ چکا اب تدارک کیا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا، خیر ہوا سو ہوا، انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالے کیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے جو عینک کی طرح لوگ آج آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔

— مولانا حالی لکھتے ہیں :

”مودی فضل حق کی تحریک سے انہوں (غالب) نے اپنے اردو کلام میں سے جو اس وقت موجود تھا، دوثلث کے قریب نکال ڈالا اور اس کے بعد اس روش پر چلنا پھوڑ دیا۔“

اردو ادب کے شیدائیوں پر مولانا فضل حق کا یہ احسان ہے کہ انہوں نے غالب کو مشکل پسندی اور بے معنی طرزِ بیان کو چھوڑ کر سادہ کہنے کی ترغیب دی، اور غالب نے آسان کہہ کر اردو کا دامن مزید بھر دیا۔ مزید غالب کا وہ کلام جو مروجہ دیوان میں شامل نہیں ہے۔ اُسے دیکھ کر اس حقیقت کا بخوبی علم ہو جاتا ہے کہ مولانا فضل حق کس قدر گوہر شناس تھے۔

مولانا کی سیاسی زندگی | مولانا کی ابتدائی زندگی دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں سیاسی امور سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان کا مطلع نظریہ تھا کہ اچھی زندگی بسر کریں۔ جہاں رہیں عزت سے رہیں، اور آرام و سکون کی زندگی گزار دیں۔ تفریح کی خاطر شطرنج یا شعر و شاعری سے دل بہلائیں۔ اور علمی ذوق کی تسکین کی خاطر بچوں کو معقولات و ادب کا درس دے لیں، البتہ آخری عمر میں انگریزی اقتدار کی خرابیاں اُن پر منکشف ہوئیں اور دیدہ و اصحاب سے بل کر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ انگریزوں کا مقصود اہل ہند کو عیسائی بنانا ہے۔ اور اس طرح اپنی حکومت کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں یہ وہ تاثر تھا جس نے ان کے سردخون میں جوش پیدا کر دیا، اور ٹھنڈے دماغ میں باغیانہ عزائم ابھرنے لگے اور آخر عملی سیاست میں کود پڑے۔ مولانا نے خود نوشت ”الثودۃ الہندیہ“ میں

مخالفت کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے مندرجہ ذیل دہرہ خاصیت لکھے ہیں۔

- ۱۔ انگریزوں کا داعیہ تبدیل مذہب۔
 - ۲۔ غلے پر کنٹرول کرنا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ غلے پر خود کنٹرول کر لیا جائے۔ جب لوگوں کو بخوراک نہ ملے گی تو وہ ہر حکم کی تعمیل پر مجبور ہوں گے۔
 - ۳۔ احکام دین مٹانا۔ مثلاً مسلمانوں کو ختنہ سے روکنا اور پردہ نشین عورتوں کو بے پردہ کرنا۔
 - ۴۔ ہندو اور مسلمان سپاہیوں کے عقائد گندے کرنا۔
- جنگ آزادی | مولانا فضل حق ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ سے الور چلے گئے تھے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں ہنگامہ شروع ہوا۔ مولانا اگست ۱۸۵۷ء میں دہلی میں وارد ہوئے، بہادر شاہ ظفر سے گذشتہ تعلقات تھے۔ اس لئے بادشاہ سے ملنے میں انہیں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ جیون لال کے روزنامے سے ان کی محل میں آمد و رفت معلوم ہوتی ہے، وہ خبریں دربار میں پہنچاتے رہتے تھے۔**

بہادر شاہ کے مقدمے میں ذکر ہے کہ ۸ اگست ۱۸۵۷ء کو دوسرے افراد کے علاوہ مولانا نے بھی مختلف افراد کے نام احکام لکھے، لیکن نواب زینت محل کے خواہیدہ ہونے کی وجہ سے ان پر نہیں نہ ہو سکیں، کیونکہ ہر نواب زینت محل کے پاس ہی تھی۔ ایک دوسرے مقام میں مذکور ہے کہ مولانا نے مولوی عبدالحق خان کے نام ضلع گورڈ گاؤہ کے مایے کی تحصیل کے لئے فرمان لکھا اور مولانا کے ایک عزیز کو وہاں بھیجنے کا فیصلہ ہوا تھا۔

مولانا کی کتاب سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ کامیابی کے بارے میں زیادہ پُر امید نہیں تھے، وہ دیکھ رہے تھے کہ۔

- ۱۔ بادشاہ ضعیف، غم زدہ اور ناتجربہ کار ہے۔
- ۲۔ بادشاہ امور جنگ خود انجام دینے کے بجائے اپنے وزیر حکیم حسن اللہ خان اور بیگم نواب زینت محل کا محکوم تھا۔
- ۳۔ انگریزوں کا مقابلہ کرنیوالی فوجیں بے سردار اور منتشر تھیں۔ ان میں کوئی رابطہ باہمی تھا۔
- ۴۔ بادشاہ کے بیٹے ناتجربہ کار بزدل اور عاقبت نااندیش تھے۔ انہیں دیاندرہ میں

اور عقل مندوں سے نفرت تھی۔

فتویٰ | مولانا دہلی پہنچے تو انہوں نے فتویٰ تیار کرنے کا مشورہ دیا۔ اور انہوں نے علماء کے نام تجویز کئے جن سے دستخط لئے گئے۔ یہ دستخط کرینوالوں میں مولانا فضل حق کے ہم سبق مفتی صدر الدین آزادہ بھی شامل تھے جن کے سلسلے میں ایک لطیف توجیہ پیش کر کے مفتی صاحب کی جان بچائی گئی۔ یہی وہ فتویٰ تھا، جو ان کے خلاف باغیانہ مقدمہ کا باعث بنا۔

دہلی سے روانگی | ۱۹ ستمبر کو شہر دہلی انگلیزی فوجوں نے تاراج کر دیا۔ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ دن بھوکے پیاسے مکان میں بند رہے۔ پھر ال و عیال کو ساتھ لیکر رات کی تاریکی میں نکلے اور مشقتوں کے بعد بھیکن پور (ضلع علی گڑھ) پہنچے۔ وہاں اٹھارہ روز رہے پھر نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمن خان شروانی کے عم محترم نواب عبدالشکور خان رئیس بھیکن پور نے سانکرہ کے گھاٹ سے جو بھیکن پور سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے، دریا کے پار اتار دیا۔ کچھ عرصہ روپوش رہے۔ عرصہ روپوشی کے حالات پردہ تاریکی میں ہیں۔

گرفتاری | ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے یکم نومبر ۱۸۵۷ء کو عفو عام کا اعلان ہوا۔ مولانا فضل حق بھی اس اعلان پر اعتماد کرتے ہوئے خیر آباد جا پہنچے، لکھتے ہیں:

”مجھے اس بات کا بالکل خیال نہ رہا کہ بے ایمان کے عہد و پیمان پر اعتماد اور بے دین کی قسم پر بھروسہ کسی بھی حالت میں درست نہیں۔ خاص طور پر جبکہ بے دین جزا و سزائے آخرت کا بھی منکر ہوئے۔“

چند روز اطمینان سے گزر گئے۔ پھر دوبے ایمان اور جھگڑالو افراد نے مخبری کی اور مولانا کو اپنے مکان سے گرفتار کر لیا گیا، اور مقدمے کے لئے لکھنؤ روانہ کر دیا گیا۔

دردِ مقدمہ و سزائے حبس دوام بہ عبور دیا۔ شہر | مولانا کے مقدمے کے بارے میں

ایک روایت زبان زدِ خاص و عام ہے کہ جب مولانا کا مقدمہ پیش ہوا تو اتفاقاً جج مولانا کاشاگرد نکل آیا۔ اس نے صدر الصدوری کے دور میں مولانا سے کچھ کام سیکھا تھا۔ وہ انہیں رہا کر دینا چاہتا تھا۔ گو انہوں نے مجسٹریٹ کی مدد کی اور مولانا کو پیچانے سے انکار کر دیا، لیکن مولانا نے برملا کہا کہ ہاں! فضل حق میں ہوں اور میں نے ہی اس باغیانہ فتویٰ پر دستخط کئے ہیں۔